افتخار شروانی

ایڈیٹر کے نام ایک خط

[محترمی ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم! سال بھر سے زیادہ ہوا، ''لبرل ازم کی تفہیم'' پڑھ کر ارادہ کیا کہ آپ کو لکھوں کہ وہ چند لمحے جو اس قسم کے نفیس مضامین پڑھنے میں صرف ہوتے ہیں، وہ زندگی کو روشن کر دیتے ہیں، لیکن یہ ارادہ کاہلی کی نذر ہو گیا، دیر آمد درست آمد۔

اس سلسلے میں، میں نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی جرأت کی ہے، نہایت منتشر اور جیسا کہ مجھ جیسے جاہل سے توقع کی جا سکتی ہے، صریحاً بے جوڑ، لیکن ان کے خلوص کی میں ضمانت دیتا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کو شائع کیجئے۔ میرے لیے یہی انعام کافی ہوگا کہ آپ ان کو اپنی مصروفیت سے تھوڑا سا وقت نکال کر احتیاط سے پڑھ لیجئے۔ [مخلص افتخار شروانی]

'المعارف' کے اپریل جون ۱۹۹۹ء کے شمارے میں ''لبرل ازم کی تفہیم'' کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ اور اہم مضمون شائع ہوا۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر میرا خیال تھا کہ یہ بحث جاری رہے گی، لیکن یہ اُمید پوری نہ ہوئی۔

میں ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری) اور ڈاکٹر منظور احمد دونوں کا مداح ہوں۔ میری تجویز یہ ہے کہ لبرل ازم کی اہمیت فی زمانہ اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ ان دونوں حضرات پر یہ لازم ہے کہ اس موضوع کا بار بار ذکر کریں۔ محض ایک سیمینار منعقد کرنا ناکافی ہے۔

البتہ، میری ناقص رائے میں ہماری حالت تو اس درجہ پست ہو گئی ہے کہ ہم شاید لبرل ازم کی طرف پہلا قدم اُٹھانے کے بھی اہل نہیں رہے۔

لبرل ازم کی اصطلاح تو یورپ ہی میں وضع ہوئی، لاسکی کی مشہور تصنیف Rise of

European Liberalism میں اس کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، جس زمانے میں یہ اصطلاح وضع ہوئی، اس زمانے کے حالات جدا تھے۔ اس وقت اس کا تعلق کلیسا کی بدعنوانی، جاگیرداری نظام کے شکنجے اور آزادانہ تجارت سے تھا۔ آج لبرل ازم زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور مغرب میں تو جغادری قدامت پسند (Conservative) بھی لبرل ازم کے بنیادی اصولوں کو اپنا چکے ہیں۔ فی زمانہ یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ لبرل ازم کی اس موجودہ شکل کے بغیر کسی مہذب معاشرے کا ترقی کرنا اکیسویں صدی میں ممکن نہیں ہے۔

کوئی بھی عقیدہ ہو، تحریک ہو، فلسفۂ حیات ہو، اس کی کامیابی کا گہرا تعلق ماحول اور تاریخی پس منظر سے ہوتا ہے۔ آپ ذرا اپنے ماحول پر نظر ڈالیے۔ مستند اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے ملک کی ایک تہائی آبادی غربت اور مفلسی کا شکار ہے۔ مفلسی کا پیمانہ ایک ڈالر روزانہ سے کم آمدنی یا پانچ افراد کے کنبے کے لیے پندرہ سو روپے ماہوار آمدنی مقرر کیا گیا ہے۔ یہ طبقہ صرف زندہ رہنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد پیٹ بھرنا ہے، جس میں وہ بیشتر کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کے لیے تو تعلیم بھی ایک بے معنی تصور ہے۔

باقی دو تہائی آبادی میں نصف بچے ہیں، جن کی عمر چودہ سال سے کم ہے۔ اس کے علاوہ نصف آبادی عورتوں کی ہے جن کو آج تک معاشرے میں وہ مقام نہ مل سکا، جس کی وہ مستحق ہیں۔ پانچ فیصدی یا اس سے بھی کم تعلیم یافتہ اور خوشحال لوگ ہیں۔ اس طبقے نے جس طرح معاشرے میں فساد پیدا کیا ہے، اس کا ذکر کرنا بے سود ہے۔ اس ماحول میں یہ امید کرنا کہ روشن خیالی اور حقوقِ انسانی کے احترام جیسے تصورات کی سمجھ بوجھ عام ہو سکتی ہے، بڑی جرأت کا کام ہے۔

اس ماحول کا ایک اور رُخ ملاحظہ کیجیے، ہماری آبادی ایک عجیب قسم کی بیزاری کا شکار ہے۔ ہم سب کچھ بھول چکے ہیں۔ ہم مسکرانا بھول گئے ہیں۔ ہم شکریہ ادا کرنا یا معافی مانگنا بھول گئے ہیں۔ ہم گھڑی دیکھنا بھول گئے ہیں۔ ہم بدبو اور خوشبو میں تمیز کرنا بھول گئے ہیں۔

ہم رنگوں کی پہچان بھول گئے ہیں۔ ہم عمر کا، علم کا، سچائی کا، بڑے چھوٹے کا، مصیبت زدہ اور معذور کا احترام اور لحاظ بھول گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ انداز تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ میں مشترک ہے۔ اس کا ثبوت آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ مثال کے طور پر سڑکوں پر چھلکے پھینکنے، کاغذ بکھیرنے میں امیر اور غریب، اور جاہل اور عالم برابر کے شریک ہیں۔ جس ماحول میں بنیادی انسانی رویہ ہی موجود نہ ہو، وہاں لبرل ازم کا ذکر کڑوے لطیفے سے کم نہیں ہے۔

ذرا تاریخی پس منظر پر بھی غور کیجئے، ہم ڈیڑھ ہزار سال سے غیر ذمہ دار، آمرانہ حاکموں کے عادی ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت کے پہلے پچیس تیس سال چھوڑ کر کوئی ایسا دور نہیں ہے، جس میں حقوقِ انسانی کا احترام حکومت کی حکمتِ عملی کا اہم حصہ رہا ہو۔ جہاں دار شاہ (۱۷۱۲ء) نے صرف ایک سال میں اس عظیم عمارت کی بنیاد ہلا دی جسے چھ ممتاز بادشاہوں نے تعمیر کیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن، عیاشی، سازش اور خوشامد کی سیاست نے ایسے قدم جمائے کہ اب تک قائم ہے۔ اروِن (Irvine) کی ضخیم تصنیف Later Mughals کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ہی زمانے کی روئداد بیان کی جا رہی ہے۔ بے حسی کا یہ حال ہو گیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر جو انگریزوں کا ایک مفلس وظیفہ خوار تھا، لال قلعے سے باہر نکلتا ہے تو ہزاروں دلّی والے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سڑکوں پر کھڑے رہتے۔ میں تاریخ کے لاکھوں ورق پلٹنا نہیں چاہتا، میری عرض صرف یہ ہے کہ ہمیں ایسے معاشرے اور ایسی حکومت کا مطلق کوئی تجربہ نہیں ہے جو انصاف اور حقوقِ انسانی کے احترام پر قائم ہو۔

انگریز شاطر قوم ہے۔ اس نے دیکھا کہ یہ قوم شاہی شان و شوکت سے مرعوب ہوتی ہے، اس پر شاہجہاں کا تختِ طاؤس اب تک مسلط ہے۔ تو اس نے بھی یہی طور طریقے اختیار کر لیے۔ وائسرائے سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک شاہانہ آداب و اطوار اپنائے گئے۔ بڑے بڑے جاگیردار، عہدہ دار، یہاں تک کہ عالم و فاضل آداب بجا لاتے اور انعام و اکرام کی خواہش کرتے۔ انگریز نے اس سونے کی چڑیا کو کیوں چھوڑ دیا۔ یہ ایک علیحدہ داستان ہے، لیکن وہ

خوشی سے نہیں گیا۔ دنیا میں جو نئی طاقتیں پیدا ہو رہی تھیں، وہ تھیں ہی ایسی کہ اسے چلے جانے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

انگریز چلا گیا، لیکن حکومت کے انداز نہیں بدلے۔ صدر، وزیرِ اعظم، وزیرِ اعلیٰ، کمشنر، اسی شان و شوکت کے قائل رہے۔ مغربی ملکوں کی برتری دوسنہری اصولوں پر قائم ہے۔ علم اور انصاف، جو ہم صرف کتابوں میں پڑھتے ہیں، ہمیں خود ان کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔

مثالیں تو بے شمار ہیں، صرف دو کافی ہونی چاہئیں۔ ہمارے قید خانے کسی بھی شریف آدمی کا دل دہلانے کے لیے کافی ہیں۔ ہزاروں بے گناہ مرد، عورتیں اور بچے، جن میں ہمارے عدالتی نظام سے نمٹنے کے وسائل نہیں ہیں، برسوں جانوروں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ہمارے تھانے ظلم و ستم کا مرکز ہیں جہاں کسی شریف مرد یا عورت کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ میں نے آج تک کسی خطیب یا واعظ کو حقوقِ انسانی کی اس پامالی کے خلاف احتجاج کرتے نہیں سنا۔

یہ ہے وہ ماحول جس سے ہم دوچار ہیں۔ مجھ سے سویڈن کے ایک نوبل انعام یافتہ عالم نے کہا تھا کہ جس قوم کو نالیاں صاف کرنا نہیں آتیں، اسے فولاد کے کارخانے لگانے کے خواب نہیں دیکھنا چاہئیں۔

تو، حضور! یہ پوری قوم مظلوم اور بے بس ہے۔ تاریخی عوامل نے اُن میں بے حسی پیدا کر دی ہے۔ میں مایوسی کا پیامبر نہیں ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس صورتِ حال میں لبرل ازم کی اقدار کو کسی نہ کسی طرح اُجاگر کرنا بے حد ضروری ہے۔ پہلا اور بنیادی قدم تو یہی ہوگا کہ کسی طرح لوگوں کو جگایا جائے۔ ان کو بتایا جائے کہ آپ انسان ہیں، آپ کے بنیادی حقوق ہیں، ان حقوق کے ساتھ آپ کے فرائض بھی وابستہ ہیں۔ یہاں کوئی سرسیّد تو نظر نہیں آتا جو لاٹھی لے کر گاؤں گاؤں پھرے، لوگوں سے کہے کہ جاگو، آنکھیں کھولو، اپنا درد بیان کرو، انصاف مانگو اور انصاف کرو۔ نہ ہی کوئی مصطفیٰ کمال نظر آتا ہے جو حکومت کا اختیار اس سمت میں استعمال کرے۔ جان سٹورٹ مل نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''آزادی''

(On Liberty) میں ہمارے لیے ایک پتے کی بات کہی ہے:

''آزادی کے اصول کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو آزادانہ اور مساوی بحث و مباحثے سے اپنی حالت بہتر بنانے کے اہل ہوں، جن میں یہ اہلیت نہیں ہے تو اگر ان کی قسمت اچھی ہے اور اُنہیں کوئی اکبر یا شارلیمان مل جائے، تو اُنہیں اس کی رہبری آنکھ بند کر کے قبول کر لینی چاہیے۔'' یہ الفاظ ایک سو سال سے زیادہ ہوئے لکھے گئے تھے۔ ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے نے اب اکبر تو کجا سرسیّد بھی پیدا کرنا خارج از امکان بنا دیا ہے، اور ویسے بھی یہ زمانہ جمہوریت کا ہے، جہاں فخریہ یہ کہا جاتا ہے کہ نا اہل، بدعنوان جمہوری نمائندے اہل اور ایماندار بادشاہوں اور حاکموں سے بہتر ہوتے ہیں۔

میں عالم نہیں ہوں، طالب علم ہوں، اتنی پیچیدہ صورتِ حال کا حل میرے بس میں کہاں! لیکن ایک بات اور عرض کروں گا۔ دینی مدرسوں کے اساتذہ چلتے پھرتے مبلغ ہیں، وہ جس قسم کے اسلامی شعائر کی تبلیغ کرتے ہیں، وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ اب تک ہمارے تعلیم یافتہ، روشن خیال اساتذہ اور عالم اپنے کتب خانوں میں قید ہیں۔ اس گھڑی میں جب کہ معاشرے کا ہر طبقہ اصلاح کرنے میں ناکام رہا ہے۔ کیا اساتذہ کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ ہمت کریں، اپنے طالب علموں میں ایک لبرل جذبہ پیدا کریں۔ اگر دینی مدارس ''طالبان'' پیدا کر سکتے ہیں تو لبرل اور تعلیم یافتہ حضرات 'پرامن' لیکن مہذب جہادی کیوں پیدا نہیں کر سکتے۔

یہ محض ایک پیش لفظ ہے، اور بے حد مختصر۔ مقصد صرف یہ ہے کہ کسی صورت سے یہ بحث تمام ملک میں چھڑ جائے، اور علم اور انصاف کے حامی ہزاروں لاکھوں میں پیدا ہونے لگیں۔ مجھے معلوم ہے 'المعارف' کا مطالعہ کرنے والوں کی تعداد محدود ہے، لیکن قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔ ہوسکتا ہے اوروں کو بھی یہ توفیق ہو کہ اس موضوع کی اہمیت عام کریں۔ والسلام!

[افتخار شروانی]

۳۳۹، پشاور روڈ، راولپنڈی

☆☆☆